Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق

ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 3, Issue 4
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

ڈاکٹر ارشد محمود ملک

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو یونیورسٹی آف لاہور، سرگودھا کیمپس

حافظ محمد ثاقب نیاز

پی ایچ۔ڈی سکالر اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور

جدید اردو نظم کی بنیاد سازی میں میراجیؔ اور مجید امجد کا کردار

Dr. Arshad Mohmood Malk
Assistant Professor University of Lahore Sargodha Campus
Hafiz Muhammad Saqib Niaz
Ph.D. Scholar Urdu Islamia University Bahawalpur

Role Of Meera Ji And Majeed Amjad In The Foundation Of Modern Urdu Poetry

Majeed Amjid and Meera Ji are pioneersof the modern school of poetry. Both are prominent and influential persons in the modern era of poems in Urdu literature. They have introduced new tech techniques and styles in the field of poems, which diverted ate the nation of new poets towards new thoughts and ideas in this field. Being modern iconic poets, they portrayed human nature and introduce new tones and unique styles of ambiguity to express outer and inner feelings. They are creative multiband i- directional and know all the ways to convey their feelings through modern urdu poems. We will explore how they have changed style and their impact on modern poems in the 21st century.

Key words: Meera Ji, Majeed Amjid , pioneer, modern poem, impacton 21st century, new style

کلیدی الفاظ: میراجی، مجید امجد، جدید نظم نگاری، اکیسویں صدی پر اثرات، نیا اسلوب

نظم میں دراصل زبان اور اسلوب کی سطح پر تجربے اور تبدیلی ہوتی ہے اور جب اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو دیکھا گیا ہے کہ ہر لکھاری کی اپنی زبان اور طریقہ اظہار ہوتا ہے۔ اسی طریقہ کو بحری سانچے میں لکھا جائے تو یہ شاعری کہلاتا ہے۔ اظہار کے لیے جو سانچے استعمال کیے جاتے ہیں کچھ شعراء نے اپنی جدت کے لیے پرانے سانچوں میں کچھ جزوی انحراف تو کسی نے کلی انحراف کیا اور ان میں سے بعض نے تو مکمل انحراف کیا اور نئے سانچے ایجاد کیے۔ اس سانچوں کی تبدیلی کے عمل کو ہیئتی تجربہ کہا جاتا ہے۔ مجید امجد اور میراجی کا شمار بھی ان صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے روایت سے ہٹ کر نئے اور کامیاب تجربے کیے اور خاص کر اردو نظم میں نمایاں تبدیلی کے موجد بنے۔ میراجی اور مجید امجد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے جدید نظم کے بنیاد ساز ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ایک مختلف رنگ بھرنے اور منفرد عکس پیدا کرنے کے لیے ایک عرصہ تک اندھیروں میں سفر کرتے رہے اور شاعری کے لیے نیا شعور اور نیا اسلوب اختیار کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جدید نظم ساز شعراء میں اکثر

 Corresponding Author،s Email: hmsaqibniaz8744@gmail.com

مماثلت نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کی روح کے اظہار کے ساتھ نئی نسل کے لیے فلسفیانہ لہجہ اور تخلیقی سوچ کو ابھارنے کی حتہ ا لامکان کوشش کی۔ جدید نظم سازی کی بات کی جائے تو ان دونوں کے نام انگلی کے پوروں پر خود بخود آجاتا ہے۔ دونوں شعرا نے روایت سے ہٹ کر نئے اسلوب اور عوامی زندگی کی ترجمانی عمدگی سے کی۔ ان کے لفظ فکر اور حکمت سے بھرپور قارئین کی سوچ کا دائرہ وسیع تر کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں تاثر اور رچاو کی کیفیات ابہام کو نئے تصور سے روشناس کروانے اور اپنے قارئین کو اپنی نئی سوچ اور نئے معیار کی طرف مکمل متوجہ کرتے ہیں۔ جہا ں میراجی کے ذہنی اور فکری ارتقا میں مغرب و مشرق کی آمیزش ملتی ہے۔ وہاں مجید امجد کی نظموں میں وقت کی لامحدودیت کے سامنے زندگی کے اختصاریت پر بے بسی کا احساس ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں جدید عہد کا کرب ملتا ہے۔ جدید حسیت معاشرے میں انسان کے کرب و ویرانی جیسا رویہ ایسے بیان کیا ہے کہ جس سے معاشرے کے اخلاقی کرب واضح ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاالحسن مجید امجد کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

> "مجید امجد ایسے شاعر ہیں جو بظاہر وقت کی لامحدودیت کے سامنے انسان کی چند روزہ زندگی کی اختصاریت پر بے بسی کا احساس پیدا کرتے ہیں لیکن دراصل وہ اس کے ذریعے چند روز کی مہلت زندگی کی نایابی کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اپنے قاری کو یہ نعمت ہر ہر پل استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔ وقت کی لامحدودیت اور اس کے سامنے انسان کی محدودیت اور بے ثباتی ایک ایسا موضوع ہے جو روزِ اول سے ہی انسان کو پریشان کرتا آیا ہے۔ لیکن مجید امجد جیسے شاعر ہمارے اندر ایسے جذبات پیدا کرتے ہیں کہ انسان کو پریشان ہو کر اس محدود وقت کو ضائع نہیں کرنے دینا چاہیے بلکہ اس کے ہر پل سے لطف اندوز ہونا چاہیے، صرف خوشی سے نہیں بلکہ غم سے بھی کیوں کہ غم بھی وقتی اور فانی ہے۔"(۱)

اردو ادب میں آزاد نظم اور علامتی شاعری کو فروغ دینے والوں میں میراجی کا نام فہرست میں سب سے اُوپر آتا ہے۔ انھوں نے آزاد نظم کی ہیئت کے ساتھ ساتھ حسیت کو بھی جدید شاعری کا اہم جزو قرار دیا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کی ان کے کلام میں خلوص اور صداقت جیسی صفات قارئین کے دل میں شاعری کا احترام خود بخود اُبھار دیتی ہے۔ یہ ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں، ایسا دبستان جس میں انسان کی ظاہر نہیں بلکہ باطنی شعور اور تحت الشعور کی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں "کوثر مظہری" لکھتے ہیں:

> "میراجی کے نزدیک صرف دو زمانوں کا تصور ہے، ماضی اور حال۔ جدید ذہن کا رشتہ ماضی سے کتنا زیادہ ہے میراجی اس سے سروکار نہیں رکھتے ہیں۔ البتہ جدید ذہن کی کشمکش سے وہ اپنا رشتہ اُستوار رکھتے ہیں۔ ان کے جذبات واحساسات کا تناظر ماضی سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں دیومالائی عناصر کی خوب خوب عکاسی ملتی ہے۔"(۲)

مجید امجد اور میراجی لوگوں کے شاعر نہیں بلکہ خوبیوں کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نظموں میں مسائل اور حالات پر اس طرح لکھا کہ قارئین کو ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے خاص فکری مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجید امجد کے یہاں ایک طرف معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو سامنے لانا اور دوسری طرف روزمرہ کی دلچسپ اور خوب صورت جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ اپنے دور کے وہ فلسفی شاعر ہیں کہ جن کی شاعری میں "وقت" کا احساس نمایاں ملتا ہے۔ اُن کی نظم "ایک شبیہ" سے چند مصرعے:

کچھ دنوں سے تو جان بوجھ کے اب
یہ سمجھنے لگا ہوں میں ہی تو ہوں
جس کی خاطر یہ عکس ابھرا ہے

کچھ دنوں سے تو اب میں دانستہ
اس گماں کا فریب کھاتا ہوں(۳)

مجید امجد اور میر اجی غزل کے مصرعے سے انحراف کرتے ہیں۔ انھوں نے غزل کا آب و رنگ نہیں بلکہ گیتوں کی آب و رنگ سے کام لیا ۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے منظر کشی، کردار اور مکالموں کو بدل کر افسانے اور ڈرامے کا طریقہ اختیار کیا۔ میر اجی نے گیتوں کی روایت کو اپنایا اور مجید امجد نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ میر اجی سماجی شعور تو رکھتے تھے مگر معاشرے سے وابستگی نہیں رکھتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں بے سمتی ملتی ہے۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر نہیں آئے۔ میر اجی کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات واضع ہوتی ہیں کہ شاعر نے چھوٹے چھوٹے واقعات و مظاہرات کے بیان سے اپنی داخلی کیفیت کا خارجی مظاہرات سے ربط قائم کیا ہے اس سلسلے میں شمیم حنفی ان کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> "سلیم احمد جب راشد اور میر اجی کو ایک نئی روایت کا بانی اور نظم جدید کا موجد (" نظم جدید کا ہاتھی سب سے پہلے میر اجی اور راشد نے نکالا"۔ سلیم احمد) کہتے ہیں اور ساری توجہ اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ "میر اجی نے کسری آدمی اور پورے آدمی کو ایک دوسرے کے تقابل میں رکھ کر دیکھا اور کسری آدمی کی پیدائش کی مختلف صورتوں پر غور کیا۔"(۴)

میر اجی کی حیثیت اردو نظم میں یکتا اور منفرد ہے۔ ان کی نظموں میں ہمیں ڈرامے اور افسانے کی طرح کے کردار بھی ملتے ہیں۔ جو نظم کے ساتھ شروع ہوتے ہیں اور نظم کے آخر تک مکمل کردار کی سی شکل بن جاتی ہے۔ اس حوالے سے ان کے کالم میں "کلرک کا نغمہ" نمایاں نظم ملتی ہے۔ ایسی نظموں میں بالکل کہانی کا انداز اور طریقہ اپنایا گیا ہے۔ اردو ادب میں شائد ہی کوئی میر اجی جیسا نظم نگار ہو جس نے اپنے کلام میں موضوعات سے اس قدر جذباتی وابستگی، شغف اور زمین سے لگاؤ کا ثبوت بہم پہنچایا۔ میر اجی کے یہاں خارجی چیزیں داخلی کیفیات سے مل کر اس کی مکمل ترجمانی کرتی ہیں۔ جس کی مثال ہم دیکھ سکتے ہیں:

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بیکار سماج
اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
مری آنکھوں میں تو مرکوز ہے روزن کا سماں
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لیے
میں اسی روزن بے رنگ میں گھس جاؤں گا
لیکن ایسے تو وہی بت نہ کہیں بن جاؤں(۵)

مجید امجد کے یہاں عام سے موضوعات پر بہت بلند پایا نظمیں ہیں۔ انسان میں بے اطمنیانی کے جذبات کے احساس کو چھوٹے چھوٹے موضوعات پر خوبصورت نظمیں موجود ہیں۔ جن میں انسان پہاڑوں، میدانوں، بازاروں، گھروں اور گلی کوچوں میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں ایک صفت یہ بھی ملتی ہیں کہ ان کے کلام میں نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ زبان اور ہیئت کے نئے تجربے ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے تجربات کو نئے تنقیدی معیار سے پرکھا جاتا ہے۔ مجید امجد کی نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاعر اپنی انا کی دیوار کو عبور کر کے وسیع زندگی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اور نظم گو شعراء میں شاید ہی کسی نے اپنے موضوع سے اس قسم کی ذاتی وابستگی اور شغف رکھا ہو جیسا مجید امجد کے یہاں

پایا جاتا ہے۔ اردو ادب کے طالب علم ان کی نظموں کے خاص انداز، علامتوں اور سوچنے کے اندازِ بیان کی آسانی سے نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اردو نظم میں ان کا انداز ایک خاص رجحان، نئے مزاج اور اردو کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کرتے ہوئے نظم کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ ان کے کلام میں یہ خوبی ہے کہ وہ حال کو اپنی گرفت میں لے کر نہ صرف وقت کی قید سے آزاد ہوتا ہے بلکہ وقت کے مدارج کو بھی روک لیتا ہے۔ ان کی نظم: "ایک شام" سے خوب مثال پیشِ خدمت ہے کہ:

تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے آ کے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی بانہوں پہ اپنی لٹیں کھول دی ہیں
یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبوئیں گیتوں کی سسکاریاں ہیں
یہ پگھلے ہوئے زرد تانبے کی چادر پہ الجھی ہوئی سلوٹیں ہیں
کہ زنجیر ہائے رواں ہیں
بس اک شورِ طوفاں
کنارا نہ ساحل
نگاہوں کی حد تک
سلاسل سلاسل
کہ جن کو اٹھائے ہوئے ڈولتی پنکھڑیوں کے سفینے بہے جا رہے ہیں
بہے جا رہے ہیں
کہیں دور ان گھور اندھیروں میں جو فاصلوں کی ردائیں لپیٹے کھڑے ہیں
جہاں پر ابد کا کنارا ہے اور اک وہ گاؤں
وہ گنے کے کیاروں پہ آتی ہوئی ڈاک گاڑی کے بھورے دھوئیں کی چھچھلتی سی چھاؤں(٦)

مجید امجد کی بہت سی نظمیں انسانی دردِ اور انسانیت سے محبت کی آئینہ دار ہیں۔ سنجیدگی سے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے یہاں شاعری کے سیاسی و سماجی پہلو ملتے ہیں۔ انھوں نے کلاسیک شعراء کی طرح حسن و شباب کی رنگینوں میں غرق ہونے کی بجائے زندگی کی حقیقتوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ ان کی زیادہ تر نظمیں جدید انسان کے مسائل و معاملات کے بارے میں ہیں۔ جن میں آج کے انسان کی مسخ شدہ حالت بتائی گئی ہے۔ انھوں نے جو بھی لکھا پردوں میں چھپانے کی بجائے واضح اور سادہ لفظوں میں لکھا۔ ان کے کلام میں ان کا ایک مخصوص، الگ اور منفرد لہجہ صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے گردوں پیش کے مسائل کے ساتھ ساتھ عالمی منظر نامے پر ہونے والے ظلم اور تشدد کو شدت سے محسوس کیا۔ مجید امجد کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں کہ:

> "مجید امجد کی نظموں میں قریبی اشیاء کے وجود کا گہرا احساس ہوتا ہے۔ ممٹیاں، کلس، گلیاں، بس اسٹینڈ، پان، چائے کی پیالی، دھوپ رچے کھلیان، آنگن، نالیاں اور اس طرح کی ان گنت دوسری اشیاء جو شاعر کے ماحول کا حصہ ہیں بڑی آہستگی سے اس کے کلام میں اُبھرتی چلی آتی ہیں۔ شاعر کا مشاہدہ بڑا گہرا ہے اور اس کی نظروں سے ماحول کا کوئی نوکیلا پہلو اوجھل نہیں۔ تاہم مجید امجد کا یہ مشاہدہ محض خارجی ماحول کی تصویر کشی تک محدود نہیں۔ یہ سارا

ماحول اور اس کی اشیاء شاعر کے تجربے کی چکاچوند سے اکتسابِ نور بھی کرتی ہیں۔ اور نتیجہ ہانپتی، دھڑکتی اور مچلتی ہوئی نظر آتی ہیں"(۷)

میراجی کا دور اس لئے بھی اہم مانا جاتا ہے کہ ان کا دور ذہنی اور جذباتی لحاظ سے آزمائش کا دور مانا جاتا ہے۔ ان کی ذات کو کئی زمانوں کا سنگم کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شاعری بنیادوں کا سراغ اپنے حساب سے لگایا۔ ناصر کاظمی یہ خیال کرتے کہ میراجی کی شاعری کی جڑیں اپنی زمین کی روایت میں ہیں۔ وہ اپنے دور کی روح کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ میراجی نے آزاد نظم میں خیال کے اعتبار سے مصرعہ ترتیب دیا ہے۔ ایسے کہ پہلا مصرعہ خیال کے دوسرے مصرعے پر پورا اُترے۔ اُن کی نظموں میں شعری لوازمات بڑی احتیاط سے استعمال کئے ہیں۔ اپنی نظم "سمندر کا بلاوا" میں اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ:

بُرا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہو گا خدایا خدایا
کبھی ایک سسکی کبھی اک تبسم کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیات دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیئے جا رہی ہے(۸)

مجید کی نظموں کے تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک شجر دوست، دست گیر، محبوب اور بھکاری عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ بندا، دور کے پیڑ، سوکھا تنہا پتا، طلوع فرض، بن کی چڑیا، آٹو گراف جیسی منفرد اسلوب کی نظمیں ہیں۔ جدید نظم نگاری میں ان کا فن مانا جاتا ہے۔ "مقبرہ جہانگیر" جیسی نظموں میں بادشاہوں کے جاہ و جلال کی منظر کشی کی ہے۔ اور "امروز" میں انھوں نے زمانہِ حال کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی، اور زمانے کی وسعت کو ماضی، حال اور مستقبل میں زیادہ اہمیت حال دی۔ ان کی نظم "امروز" میں کچھ اس طرح بیان ہے کہ:

مجھے کیا خبر وقت کے دیوتا کی حسیں رتھ کے پہیوں تلے پس چکے ہیں
مقدر کے کتنے کھلونے زمانوں کے ہنگامے صدیوں کے صدہا ہیولے
مجھے کیا تعلق میری آخری سانس کے بعد بھی دوش گیتی پہ مچلے
مہ و سال کے لازوال آبشار رواں کا وہ آنچل جو تاروں کو چھو لے
مگر آہ یہ لمحۂ مختصر جو مری زندگی میرا زادِ سفر ہے
مرے ساتھ ہے میرے بس میں ہے میری ہتھیلی پہ ہے یہ لبالب پیالہ
یہی کچھ ہے لے دے کے میرے لیے اس خرابات شام و سحر میں یہی کچھ
یہ اک مہلت کاوش درد ہستی یہ اک فرصت کوشش آہ و نال(۹)

میراجی کے یہاں خیالات کے اظہار کے لیے نئی علامتیں اور نئی اصطلاحات کو وضع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ ان کے بعد آنے والے ادیبوں کو اس کا فائدہ زیادہ ہوا ہے۔ انھوں نے ایک عظیم شعری اسلوب کی بنیاد رکھی جس نے مستقبل کے شعراء کے راستے ہموار کیے۔ انھوں نے نظموں کے تجزیاتی مطالعہ اور ہیئتی تکنیک کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

آگے بات بڑھائیں کیسے بات بنے تو بات بڑھے

اب تک رنگ اکہرا تھا گر کوئی بڑھا تو ہاتھ بڑھے
ہونی کی توریت یہی ہے چھوٹے دن کی رات بڑھے
اب تو جو بھی بڑھنا چاہے اپنے ساتھ ہی ساتھ بڑھے
آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر اک آگے اک پیچھے ہے
پیچھے والا کیسے بڑھے جب آگے والا بھی دوڑے
دونوں چوٹ برابر کی ہیں یہ دونوں سے کون کہے
ہار اور جیت اسی میں ہے اب کون رکے اور کون بڑھے (۱۰)

مجید امجد نے نئے تناظر سے ہٹ کر ایک مختلف آہنگ کو اپنایا۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے اپنی شاعری کے لیے خام مال لیتے اور پھر اُسے مجموعی زندگی کے رنگ میں متوسط طبقے کے المیے کو عام سے انداز میں اس طرح پیش کرتے کہ قارئین کے دل میں اُتر جاتی۔ وہ زندگی کی گہری تلخیوں میں اُمید اور خوشی کی راہ نکالتے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں کائنات کا گہرا مشاہدا پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جدیدیت سے بھرپور ملتی ہیں۔ 'مقصود زاھدی' اپنے مضمون 'مجید امجد، افسردگیٔ مجسّم' میں کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ:

> "مجید امجد کی نظموں میں کئی ذہنی رویوں کئی تہذیبوں اور متعدد اذکار کی پرچھائیاں ملتی ہیں لیکن ان کا اپنا اسلوب جہاں سارے مواد کو جب اپنے قالب میں ڈھال کر اپنے افسردہ اور اداس ذہن کے نہاں خانے سے مرصع کر کے نکالتا ہے تو ہر شے کی بے بضاعتی اور بے ثباتی کا اک منفرد اور واضع اظہار بن جاتا ہے۔"(۱۱)

میراجی کے یہاں جدید نظم نگاری میں پیراہن اور ملبوسات کا ذکر تہذیب کے حوالے سے خاص پسِ منظر رکھتا ہے۔ ان کی شاعری پُراسرار اور وسیع فکری تناظر کی حامل ہیں۔ ان کی نظموں کا انداز سادہ مگر کوئی سرا آسانی سے ہاتھ نہ آنے والا ہے۔ میراجی کے یہاں خود اذیتی اور ملامتی انداز بہت ملتا ہے۔ ان کے قارئین کو عدم کا خلد، آنگنے اور تنہائی کے اثرات ملتے ہیں۔ عورت کے بارے میں بھی ان کے خیالات منفرد ہیں۔ ان کی نظم "طالب علم" میں عورت کی عکاسی کچھ اس طرح سے ملتی ہے کہ:

تمہیں معلوم ہے تیمور کی فوجیں جس وقت
اپنے دشمن پہ بڑھا کرتی تھیں
عورتیں پیچھے رہا کرتی تھیں
اور جو عالم تھے فاضل تھے ان انسانوں کا جرگہ سب کے
پیچھے پیچھے ہی چال کرتا تھا
کس لیے سب کو رہ زیست پہ ہر گام بڑھانے والے
سب سے پیچھے ہی چال کرتے ہیں
علم میں ایک ہی بنیادی کمی ہے ورنہ
علم ہر ایک زمانے میں ہر ایک شے سے ترقی پاتا
آج اقبال یہ کہتا ہے کہ عورت ہی کا شعلہ وہ جس سے یونان
حشر تک علم فلاطون سے رہے گا زندہ (۱۲)

مجید کی نظموں میں مزاحمتی آواز بھی ملتی ہے۔ اور سب سے خوبصورت بات یہ کہ انھوں نے اپنی آواز درختوں، جانوروں اور پرندوں کے لیے اُٹھائی ہے۔ نظم "بھادوں" میں جدید مشینی تہذیب اور فطرت کے ذریعے افتراق کو واضع کرتے ہوئے ماضی اور حال میں اس کا احساس دلایا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم "افریشیا" جس میں سرد علاقوں سے آنے والے پرندوں کی تکلیف اور درد کو احتجاجی انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتدائی نظموں میں روایتی ہیئت کا استعمال کیا مگر بعد میں آزاد نظم میں لکھا۔ وہ اپنی زندگی کی محرومی کا ذکر کرتے ہوئے مظاہر فطرت کی بھی عکاسی کرتے ہوئے ملتے ہیں "ایک کوہستانی سفر کے دوران میں" انھوں نے انسانی عظمت کے تصور کو حقیقت سے روشناس کروایا۔ "فرضِ طلوع" میں امیر اور غریب کے المیے کو بیان کیا۔ اور انسان کے جذبات کا خاکہ پیش کیا۔ ان کی ایک اور نظم "کنواں" جس میں انھوں نے وقت کے تصرف کو کنواں کی عالمیت پیش کی گئی کہ۔

یہ بھی کیسا زمانہ ہے
جب اچھوں کی سب اچھائیاں بروں کے ہاتھوں میں
حربے ہیں سچے لوگ اگر جیوٹ ہوں
کون ان کے منہ آئے گا
جھوٹ کے اس تالاب کے سب کچھوے
اپنے اپنے خول میں اپنے اپنے کالے ضمیروں میں
چھپ جائیں گے (۱۳)

میراجی کو تصور بہت عزیز تھے۔ ان کے یہاں تصور سے بھرپور نظمیں ملتی ہیں۔ بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ میرا سین بھی ایک تصور ہی ہے۔ اور یہ کردار ایک شعوری وجود سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ان کی تصوراتی نظموں میں "افتاد"، "اجنبی انجان عورت"، "سنجوک" اور دکھ دل کا دارو" شامل ہیں۔ قارئین کو ان کے حالات اور واقعات کی آگاہی کے بغیر کم ہی سمجھ آتے ہیں۔ جدید اردو نظم کی بنیاد سازوں میں ان کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اس دبستان کے بانی ہیں جو انسان کے ظاہر کی بجائے باطن کو اہمیت دیتے ہیں بقول زرینہ زریں۔

> "میراجی حلقہء اربابِ ذوق کی تحریک اور جدید اردو نظم کے سب سے زیرک، باکمال اور تخلیقی اعتبار سے مخلص شاعر تھے۔ انھوں نے غیر ملکی شعراء کے مطالعے اور مغربی ادب کے تراجم کے ذریعہ جدید شاعری کے اصول مرتب کئے اور حلقہء اربابِ ذوق کے شعراء کی تربیت اسی مناسبت سے کی۔" (۱۴)

میراجی جب جنگل کو علامتی طور پر استعمال کرتے ہیں تو اس کو کثرت کے معانی میں لکھا۔ ان کے یہاں سورج کی علامت رقیب کی ہے، ان کی نظم "آمد صبح" میں وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں رات چلی گئی، دن آگیا اور سورج اپنی سیج پر اُٹھ گیا ہے۔۔ ان کے ہاں "سمندر" کو زندگی کے استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ میراجی کو سمندر کی علامت بہت پسند ہے۔ سمندر کو غیر شخصی جذبہ سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی نظم "دھوکا" میں اس کا استعمال کیا ہے۔ روزن اور ساڑھی کو جنسی علامت کے طور پر لکھا۔ میراجی کی نظموں میں ہمیں عشق کی آزادی کی خواہش اور ایک فرد کی جذباتی کیفیت و سماجی احساس سے پیدا ہونے والی کشمکش ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی اور موت کی لڑائی میں ہر خوشی کا اختتام موت پر ملتا ہے۔ میراجی کے یہاں ہمیں آزاد کے ساتھ پابند نظموں میں ہیئت کے تجربے، ہندی لفظوں کو اپنانا اور جدت پسندی کا آغاز ملتا ہے۔ ان کی نظم "اجنتا کے غار":

دھیان کی جھیل میں لہراتا کنول کا ڈنٹھل

سوچ آتی ہے مجھے کیوں ہوئی پروا چنچل
دھیان کی جھیل میں ہر چیز ہے کومل شیتل
جیسے ناری ہو اٹھائے ہوئے امرت چھاگل
کیا کنول تال کا منظر نہیں دیکھا تو نے
پیڑ بھی ہیں، پتے بھی ہیں، پودے بھی لہراتے ہیں(۱۵)

یہ اردو ادب کے شاید واحد شاعر ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہیں کہ ان یہاں فطرت اور ماحول کی مکمل مثال ملتی ہے۔ مجید امجد نے فطرتی اور اساسی ماحول سے انحراف کی بجائے اپنا الگ راستہ اور منفرد پہچان بنائی اور اپنے قارئین کو جدید عہد کی حسیت سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہمارے ارد گرد ہونے والے حالات و واقعات پر سوچ بچار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ ایک عام بات کو انوکھے لب و لہجے سے بیان کر کے قارئین میں زندگی کی بے مائیگی اور ناپائیداری کا تصور اُبھرانے کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔ اپنی نظم "بس سٹینڈ پر" میں لکھتے ہیں:

ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمت آدم
بسے گی اک نئی دنیا سجے گا اک نیا عالَم
شبستاں میں نئی شمعیں گلستاں میں نیا موسم
وہ رُت اے ہم نفس جانے کب آئے گی
وہ فصل دیر رس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی(۱۶)

مجید امجد کی وہ نظمیں جن میں فطری ربط اور موسموں کی بات ہوئی ہے، ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کو انسانی ڈھانچے میں پیش نہیں کیا۔ بلکہ فطرت کو ایسے روپ میں دکھایا کہ اس کے اصل معنی سے گریز کر کے اس کو استعاراتی اور علامتی لحاظ سے استعمال کیا۔ اور اس کے اصل مقصد اور روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ناصر عباس نیئر کے مطابق مجید امجد کے جمالیاتی رتبہ کی دو نمایاں سطحیں ہیں۔ جن میں پہلی یہ کہ ان کے شعری اظہار میں فطرت بحیثیت فطرت جداگانہ وجود رکھتی ہے جس میں کسی دوسرے کی نمائیدگی یا ترجمانی نہیں ہے۔ اور دوسرا یہ کہ انھوں نے انسان کے سماجی، نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی تجربات کو استعارات و تشبیہات کے زمرے میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے نظموں کا آغاز تمثیل سے کیا۔ ان کے نظموں میں فطرت نگاری تو کم ہی ملتی ہیں۔ جیسے "ریل گاڑی"، "گائوں"، "اَبر صبوح" اور "سیر سرما" جیسی نظمیں میں فطرت نگاری کی نفی بھی ملتی ہے۔

'شبِ رفتہ' کے بعد جو شاعری ملتی ہے اس میں ذات کی محرومی سے لے کر زندگی کی محرومیوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں باقاعدہ یا روایتی صوفیانہ عنصر تو نہیں ملتے مگر کہیں کہیں جب وہ فطرت کے مظاہرات کی بات کرتے تو یہ جھلک ضرور ملتی ہے اور پھر فطرت نگاری کے ساتھ علامت نگاری اور تشبیہ و استعارات نے ان کے کلام کو عروج بخشا۔ ان کے بارے میں 'گلاب کے پھول' میں بشیر احمد چودھری اس طرح رقم طراز ہیں:

> "مجید امجد کی دورِ آخر کی نظموں میں وہی جُست اور اس کے خطرات کی تصور کشی ہے, جس کی تیاری میں وہ عمر بھر مصروف رہے۔ رویّوں، عادتوں، اصولوں، تنظیموں اور وابستگیوں کی زنجیریں بڑی مضبوط تھیں۔ اس لئے شروع شروع میں انھوں نے باضابطہ شہری کی طرح انہیں قبول کیا۔ پھر ان کے خلاف اظہارِ شک شبہہ کیا پھر ان کو توڑ توڑ کر پھینک دیا اور بالآخر جست لگا کر حدود کون و مکان کے ماوراچلے گئے۔ جست مرگ ان کی آخری جست تھی اور

اس عمل کی آخری منزل جو بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ وہ تسلسل کے اس دریا کا حصہ بننا چاہتے تھے جو انہیں بہت عزیز تھا۔"(۱۷)

میراجی اور مجید امجد کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ بھی مانی جاتی ہے کہ ان کی شاعری میں مختلف اجزاء کا امتزاج فکری، جذباتی رجحانات اور ہم آہنگی کا ایک مسلسل عمل پایا جاتا ہے۔ جدید شاعری صنعتی شہروں کی شاعری مانی جاتی ہے۔ صنعتی انقلاب نے انسان کی نفسیات اور رشتوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ سادگی کی جگہ پیچیدگی نے جگہ لے لی۔ اور اس کے اثرات بالواسطہ یا بالواسطہ اردو ادب نے بھی قبول کیے ہیں اور اس کے شواہد ہمیں ان کی علامتی نظموں سے ملتے ہیں۔ مجید امجد اور میراجی دونوں نے اپنی ذات کو علامت کے طور پر پیش کیا اور اپنی نفی کرتے ہوئے اپنے فن کو عروج تک پہنچانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ انھوں نے نظموں میں فطرت نگاری، معاشی و معاشرتی مسائل، زندگی اور موت کے احساس، کائنات کی وسعت جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا۔۔ روایت سے انحراف کے ساتھ داخلی و خارجی کیفیت کو ایسے پیش کیا گیا ہے کہ قائین نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ ان کو کلام میں اپنے جذبات کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ مجید امجد اور میراجی نے روایت کی اندھی تقلید کی بجائے روایتی فکری اُسلوب اور افکار کو بدل کر ایک نیا لہجہ اور آہنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ سماجی و معاشی مسائل کو تشبیہ و استعارات میں برملا استعمال کیا، اور اپنی الگ شناخت قائم کی۔

حوالہ جات

1 ضیاالحسن، امروز، مشمولہ، مجید امجد کی نظمیں (ڈاکٹر آصف علی چھٹہ)، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۴ء ص ۷۳

۲: کوثر مظہری، جدید نظم :حالی سے میراجی تک، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۸ ء، ص ۳۷۷

۳: مجید امجد، کلیات مجید امجد، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، فرید بک ڈپو لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۴۳۱

۴: شمیم حنفی، میراجی اور ان کا نگار خانہ، دہلی کتاب گھر ، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴

۵: میراجی، میراجی کی نظمیں، مرتب، مرغوب علی، نصرت پبلی شرز، امین آباد لکھنؤ، ۲۰۱۳ء، ص ۸۷

۶: مجید امجد، کلیات مجید امجد، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ص ۴۰۶

۷: وزیر آغا، نظم کی جدید کروٹیں، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۰ء، ص ۸۳

۸: میراجی، سہ آتشہ، رخشندہ کتاب گھر بمبئی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۰

۹: مجید امجد، شبِ رفتہ، نذیر احمد چودھری، سعید آرٹ پریس، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۷۰

۱۰: میراجی، میراجی کی غیر مطبوعہ نظمیں ،ناشر شاہد قریشی، ص ۴

۱۱: قید پارسی :شمارہ009 –، 008، ایڈیٹر، تاج سعید، مکتبہ ارژنگ، پشاور ۱۹۵۷ء، ص ۲۱

۱۲: میراجی، سہ آتشہ، ص ۲۴۴

۱۳: مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص ۵۹

۱۴: زرینہ زریں، حلقہ ارباب ذوق اور اردو نظم ،ص ۵۳

۱۵: میراجی، کلیات میراجی، مرتبہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز، لندن، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷۸

۱۶: مجید امجد، شبِ رفتہ، ص ۱۱۱

۱۷: مجید امجد :شخصیت، فن اور منتخب کلام :گالب کے پھول، بشیر احمد چودھری، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۸